مکتبۂ معروضی نقد و نظر کا فکری نمایندہ: اظہر غوری

(The Intellectual Representative of the School of Objective Criticism: Azhar Ghouri)

DOI:https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2024.08012139**

ڈاکٹر محمد امجد عابد

Dr. Muhammad Amjad Abid
Associate Professor, Department of Urdu
University of Education, Lahore

ڈاکٹر فوزیہ شہزادی

Dr. Fouzia Shehzadi
Assistant Professor Urdu (Visiting)
Division of Education
University of Education, Township, Lahore

Abstract:

Object oriented approach of criticism has its roots in post continental philosophies based on perdiction and vision. Azhar Ghouri has strong advocacy for universalization of values and global adaptation of critical thinking styles. He believes in sublimity of art and architecture regardless of classic or modern as a label for critical analysis. He believes in exploration of ideas and vision with insight into any piece of literature beyond its mechanical structure. Colonialism, exploitation, industrialisation, hunger, fear, shelter, peace and justice are controversial in global village according to Azhar Ghouri which needed to be reflected in art and literature in modes of individual's interest. This artical explores gross root level realities and fundamental beliefs of object-oriented approach in literary works of Azhar Ghouri enveloped with the agitation through pen used as an eye opener initiative to stimulate the readers.

Keywords:

Azhar Ghouri, Universalization, Globlization, Colonialism, Industrialisation, Objective Criticism, Art, Architecture, Culture, Civilization, Objectivity, Dictatorship, Democracy.

اظہر غوری کی فکری نشو و نما ۱۹۸۰ء میں حلقہ اربابِ ذوق مرکزِ پاکستان اور پھر حلقہ اربابِ ذوق شاخِ لاہور میں

بطور جوائنٹ سیکرٹری ہوئی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین، لاہور کی مجلسِ عاملہ کے رکن، حلقہ تصنیفِ ادب کے آرگنائزر، لاہور پریس کلب کی لٹریری کمیٹی سمیت متعدد ادبی تنظیموں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۱۹۹۹ء میں اظہر غوری کی نظمیں "غیر مشروط محبت" شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں بیسویں صدی کی گذشتہ چار دہائیوں میں ان کے قومی اخبارات نیز ادبی مجلّوں اور کتب میں سینکڑوں مضامین، دیباچے اور فلیپ شائع ہوئے۔ ان کی گراں قدر، ہمہ جہت ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر ملک کی مختلف مؤقر جامعات میں تحقیقی مقالات سپردِ قلم کیے جا چکے ہیں۔ حال ہی میں لاہور لیڈز یونیورسٹی سیشن ۲۰۲۰-۲۲ء میں انیس فاطمہ نے "اظہر غوری کی ادبی جہات، تحقیق و تجزیہ" کے موضوع پر ایم۔فل کی ڈگری لی۔ قبل ازیں منصورہ زینب نے "اظہر غوری کی شاعری میں سائنسی شعور" کے موضوع پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد سے ایم۔فل سیشن ۲۰۱۸-۲۰ء میں تحقیقی مقالہ لکھنے پر ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل ایم۔فل سیشن ۲۰۱۷-۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے سلمان نور نے "غیر مشروط محبت از اظہر غوری کا فنی و فکری جائزہ" کے موضوع پر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی تھی، سیشن ۲۰۱۷-۱۹ء میں ہی رابعہ مشتاق نے "غیر مشروط محبت از اظہر غوری کا موضوعاتی مطالعہ" کے موضوع پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد سے ایم۔فل کیا تھا۔ مزید برآں ایم۔اے کی سطح پر اظہر غوری کی شاعری بالخصوص نثری نظموں پر متعدد سکہ بند اہم ناقدین کے مضامین اور محققین کے مقالات قلم بند کیے جا چکے ہیں۔

بطور ناقد اظہر غوری تخلیقی ادب کو کسی بندھے ٹکے نظریے کا پابند نہیں جانتے۔ اُنھوں نے نہ صرف اپنی شاعری، تنقیدی استعداد اور اہلیت سے اپنی تخلیقی شخصیت تعمیر کی، بلکہ اپنی تنقیدی تحریروں کی وساطت سے قارئین کو اجتماعی تخلیقی تجربے میں بھی شرکت پر آمادہ کیا ہے۔ وہ اُردو ادب میں لسانی تشکیلات اور نئی نظم کی تحریکوں کا حصہ رہے، تاہم وہ ہیئت اور اُسلوب کے ساتھ معاصر سماجی، معاشی اور بین الانسانی صورتِ حال کے تناظر میں ہم آہنگی، یکجہتی اور مساوی حقوق فراہم کرنے والے نظریۂ ادب کے داعی ہیں۔ انھوں نے نیر اقبال علوی کے افسانوی مجموعہ "جہانِ رنگ وبو" پر تنقیدی محاکمہ رقم بند کیا۔ اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "'جہانِ رنگ و بو' کے خالق نیر اقبال علوی گذشتہ تیس برس سے جرمنی کے شہر "فرینکفرٹ" میں مقیم ہیں۔ پاکستان اور جرمنی کی تہذیبی اور تمدنی صورتِ حال اُن کے تخلیقی شعور کے بیک وقت اجزائے لاینفک ہیں۔ اِن افسانوں سے پاکستان اور جرمنی کے جغرافیائی، معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور عمرانیاتی تناظر میں بسر ہوتی ہوئی رنگارنگ زندگی کی تفہیم، اِن تہذیبوں کے کوائف و مظاہر سے آگاہی کے حصول کے علاوہ، اُن کو ارزاں ہونے والی وسعت، تنوع اور پیچیدگی کا ادراک وارد ہوتا ہے۔

نیر اقبال علوی کے افسانوں کا من حیث المجموع جائزہ لیتے ہوئے اِس تمہید پر اِصرار کرنے کا مدّعا کہ اِن افسانوں میں پاکستان اور جرمنی کے جغرافیائی اور تمدنی کوائف کی باس جھلکتی ہے، یعنی کسی ادب پارے کے تخلیقی عمل میں اُس کا سیاق و سباق اور مقامی رنگ ازحد اہمیت رکھتا ہے۔ غالباً اِن کہانیوں کے علامتی افسانے میں منقلب ہونے کا ایک سبب بھی یہی دُہری شہریت ہے۔ یوں نیر اقبال علوی کے افسانوں میں کردار و واقعات دُہری معنویت کے ترفع سے لیس ہیں، اور ہر افسانہ اپنے معانی کی دونوں سطحوں کے اعتبار سے ایک بامعنی اور مربوط کہانی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ افسانے علامتی ہونے کے علاوہ مربوط کہانی پن کے مظہر ہیں۔"(۱)

اظہر غوری کا نقطۂ نظر ہے کہ خواہ ادب کسی جغرافیے اور کسی بھی زبان میں لکھا گیا ہو، وہ کسی ملک یا قوم کے بجائے عالمگیر ہوتا ہے۔ بلاشبہ تمام تہذیبیں اِسی دنیا سے وابستہ ہیں جو تمام انسانوں کی مشترک ملکیت تھیں، شومیِ قسمت سے اسے مفاد پرست اجارہ داروں نے بالادستی اور جبر سے قبائلی، جغرافیائی، قومی، مذہبی، لسانی اور معاشی طریق پر تقسیم کر کے عوام کو محکوم بنالیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ روایت، اقدار، سماج، ثقافت، تہذیب کے زیرِ سایہ تخلیق ہونے والا فنون و ادب ایک عالمگیر وحدت ہیں، جب کہ مختلف خطوں میں ماحولیاتی تبدیلیوں، موسمیاتی تغیر اور طرزِ حیات میں فرق کی بدولت ان کے طرزِ حیات، رویوں اور رنگوں میں فطری تبدیلیاں رونما اور راسخ ہوتی رہی ہیں، نیز خواہ انسان کہیں کا ہو اور کسی بھی رنگ، نسل، طبقے، مذہب اور ملک سے تعلق رکھتا ہو، اُس کے خواب، آرزوئیں، خواہشات، ضروریات اور جذبہء ترقی میں کوئی تفریق نہیں ہوتی، لہٰذا ادب اور تنقید مقامی ہونے کے باوجود عالمی سطح اور حیثیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ اظہر غوری کہتے ہیں، فرد یا معاشرے کی نئی تشکیل کے بجائے سوچ، خیال یا فکر کو تعصب، فرسودگی، انحطاط اور جمود کی قید سے آزادی دِلانے کی ضرورت ہے، اور یہ جدوجہد ادب و تنقید کے ذریعے ہی کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ تخلیقی ادب قدیم یا جدید نہیں ہوتا، جو تحریر اپنے قاری کی ذہنی سطح اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کو مثبت ارتقا سے منسلک کرنے کی محرک ہو وہ تا ابد جدید ادب کا حصہ رہے گی۔

اظہر غوری حقیقت پسندانہ، عقلی اور سائنسی ادبی رویوں کی ترویج چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُردو اَدب زیادہ تر محکوم و مجبور عوام کی مجبوریوں، مشکلات اور خوف و تشدد زدگی کی عکاسی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس میں تعیش کی خیال آفرینی محرومیوں اور خواہشات کی نمایندگی کی ترقی ہے جب کہ اداروں کی لاقانونیت، بدنظمیِ حیات کا جبر، سماجی و معاشی مصائب اور آزادیِ اظہار کی پابندیاں ہی بھولے بھالے ناقدین کو ایمائیت کے مظاہر محسوس ہوتی ہیں۔

اظہر غوری نے اپنے تنقیدی مضامین اور آرا میں ادبا کی تخلیقی تجربیت سے تجزیاتی رسائی کے ذریعے ادبی

طرزِ احساس اور تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ہموار راہوں کی نشاندہی بھی کی۔ قارئینِ ادب کو مقصودہ منازل تک لے جانے والی نئی شاہراہیں تعمیر کرنے کے منصوبے بھی پیش کیے ہیں۔ اظہر غوری کا نقطۂ نظر تہذیب، روایات اور قوم کے تناظر میں ادب کا محاکمہ کرنے کے بجائے افرادِ معاشرہ کی نجی زندگی کے رویوں سے تہذیب، روایات اور قومی زندگی کی جانچ پرکھ اور جائزہ لینے پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصنافِ ادب کے معروضات، موضوعات اور کردار ہی کسی بھی تہذیب، روایات اور قومیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر شومیٔ آمریت سے ہمارے ہاں بیش تر غیر نمایندہ علامات، موضوعات اور کردار بالجبر ادب کا حصہ بنانے کی سازش کی گئی، جس کے باعث اردو ادب تقسیمِ ہند سے پہلے والی اپنی سابق شناخت سے بھی محروم کر دیا گیا۔

اظہر غوری کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاں طالع آزما غیر دستوری اور لاقانونی ہتھکنڈوں سے حاکمیت قائم رکھنا چاہیں، اختلافِ رائے برداشت کرنے کا یارانہ رکھیں، آزادیِ اظہار کو سنگین جرم قرار دیں، جمہوری اور انسانی حقوق کے لیے آواز اُٹھانے والوں کو ماورائے مقدمات وعدالت اغوا کر کے ذہنی، جسمانی اور سماجی تشدد سے توبہ اور معافی کے اعلانات کروا کر نشانِ عبرت بنائیں، خلوت کی حرمت پامال کریں، ایذا رسانی سے ثبوت پائیں، عقوبت خانوں میں بند رکھیں، انصاف مہیا کرنے کے ذمہ دار غیر قانونی اور غیر آئینی فیصلے صادر کریں، حتیٰ کہ سلامتی کے ادارے اذیت ناک قتل کر کے استحکامِ مملکت کا جشن منائیں، وہاں کے ذمہ دار ادبا اپنے قارئین کو علامتیت، استعارے، تجریدیت، لایعنیت، لسانی تشکیلات وغیرہ وغیرہ جیسے ملفوظات میں ہی تخلیقات پیش کر سکتے ہیں، وگرنہ بے قصور مارے جائیں۔ یہی وَجہ ہے کہ تخلیقی ادب کی فکری نشوونما خاصی محدود رہی، جب کہ تحقیق وتنقید کی بنجر اراضی کو قابلِ کاشت بنانے کا دُور دُور تک کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

بلاشبہ پاکستانی ادب کا نمایاں تر حصہ آمریت کی پیداوار ہے، جو غلامانہ ذہنیت ہی پروان چڑھانے میں معاون ہے، جب کہ بقیہ تخلیقی حصے میں بھی آمریت کے گہرے اثرات سرایت کیے ہوئے ہیں۔ دراصل یہاں حکومتی تبدیلیوں کے پس پردہ کیے جانے والے احتساب، احتجاج، مزاحمت، جلوس، دھرنے اور بغاوت اشرافیہ اور مقتدرہ کا ناٹک تھا، جو حکمران سازوں کے عوام کش اقدامات کا مرہونِ منّت ہے۔ ساڑھے سات دہائیوں سے ادبا اور ناقدین، معاشرے پر مسلط بدترین جبر کو محسوس کرتے ہیں، وہ اِس کا واضح اظہار، تجزیہ اور کوئی نتیجہ خیز لائحۂ عمل پیش نہیں کر پائے۔ معروف افسانہ نگار سمیع آہوجا کے حوالے سے اظہر غوری کی رائے قدرے مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عام قاری کے لیے سمیع آہوجا کی نثر کی تفہیم کوئی کارِ آسان نہیں، کیوں کہ اس میں معانی کی دریافت کا طریقِ کار مرکزی اور بنیادی ہے، جسے نظر انداز کر دیا جائے، تو وہ اصول وضع کیے جانے ممکن نہیں رہتے جن کی کارفرمائی ادب پارے میں معانی پیدا کرتی ہے۔

”سمیع آہوجا کے لیے افسانہ صرف اپنے خیالات، کیفیات اور تاثرات کو بیان کر دینے کا

ہی نام نہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ کوئی بھی وقوعہ بظاہر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم بہ خوبی علم رکھتے ہیں کہ آئے روز پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا سے پے در پے وقوعے نشر ہوتے رہتے ہیں اور ہمارے مقبول و معروف کہانی کار اور ڈراما نویس شب و روز انھی کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ گردان کر افسانے، ناول اور ڈرامے گھڑ گھڑ کر ڈھیر لگاتے رہتے ہیں۔ بہر حال سمیع آہوجا جس سرزمین کے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں، اُس کے سماجی، معاشی، اور سیاسی مسائل کو بھی نمایاں کرتے ہیں اور اِس کے ساتھ وہاں کی مقامی زبان کو بھی ریکارڈ پر لاتے ہیں، یوں قاری نہ صرف تخلیقی موضوع سے آگاہی حاصل کرتا ہے، بلکہ تہذیب ولسانیات کے علم سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے"(۲)

اظہر غوری کا مؤقف ہے کہ اگر افرادِ قوم ناخواندہ اور مبتلائے جہل ہوں تو انھیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا، کیوں کہ سبھی بنیادی انسانی حقوق کے لحاظ سے ہر فرد کی تعلیم و تربیت، طبی امداد اور روزگار کا بندوبست کرنا ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ بعینہٖ اگر صحافی، دانش ور اور ادبا قارئین، سامعین اور ناظرین کی خرد افروزی، فکری پرداخت، بیدار ضمیری اور جہت نمائی سے قاصر رہے ہیں تو اِسے ہر سطح پر ہی قانون، آئین اور ریاست کی مکمل نامرادی سے تعبیر کیا جانا چاہیے، کہ روزگار کے علاوہ سچائی، امانت، دیانت، شجاعت، انصاف اور حصولِ تعلیم کے مواقع مہیا کرنا بھی ریاستی ذمہ داری ہے۔ نتیجتاً مقامی تجارتی ادب پھکڑ بازی، جب کہ تخلیقی ادب احساسِ ظلمت کی مُنہ، بولتی تصویر ہے۔ اظہر غوری اصرار کرتے ہیں کہ ریاست کی متواتر کج منصوبہ بندیوں اور بدعمل فیصلہ سازوں کی بے تدبیر ادبی نوازشات کے نتیجے میں قومی ادب تخلیق کیا جاتا تھا ہی، افسوس کہ سطحیت اور مقامیت پر مبنی اصنافِ ادب میں سے غالباً ہی کسی تحریر کو عالمی سطح پر ستائش مل پائی ہو۔ کئی ایک معاصر بسیار نویس تخلیقی معیار قائم کرنے اور تخلیق کاری کے ارتقائی عمل میں مخلصانہ شرکت کے بجائے اپنے معاصر حریفوں کی مت مارنے اور نیچا دکھانے کی خاطر کاغذی ردّی میں اضافہ کر کے اپنے متکبرانہ احساسِ کمتری کو چھپانے کی سعیِ لاحاصل کرتے ہیں۔

اظہر غوری نے اپنے تنقیدی مضامین، آرا اور تبصروں میں کہیں بھی زمانی اعتبار سے دورِ آمریت اور دورِ جمہوریت میں فرق کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ قارئینِ ادب کو آگاہی دیتے ہیں کہ یہاں جو نامعلوم اور نادیدہ قوتیں غیر جانب دار ہیں، دراصل وہی جانب دار ہیں، جو ایوان قانون و انصاف کے ضامن ہونے چاہییں، دراصل وہی ماورائے قانون و انصاف نظریۂ ضرورت کے نام پر انسانی حقوق کا جنازہ نکالے ہوئے ہیں اور جو ادارے غیر سیاسی ہیں، دراصل وہی سیاسی بساط پر حکومتی مہرے آگے بڑھاتے ہوئے بہر صورت دونوں اطراف سے جیتتے چلے آ رہے ہیں، آخرِ کار کبھی انھیں ہزیمت، پسپائی، شکست، سبکی کا سامنا کرنا پڑے تو اپنی ناکامیوں کا الزام اپنے ہی مہروں پر دھر کر بساط ہی پلٹ دیتے ہیں۔

اظہر غوری کا مؤقف ہے کہ یہ بے سدھ معاشرہ آپریشن تھیٹر میں اسٹریچر رکھا ہوا ہے۔اس کا سرجیکل آپریشن جاری ہے۔ سرجن کو دو ہی ماسک میسر ہیں، ایک جمہوری، جب کہ دوسرا غیر جمہوری جب آلودہ سانسوں سے کوئی ایک وائرس زدہ ماسک متعفن ہو جائے، تو سرجن اپنی حفظانِ صحت کے پیشِ نظر ماسک تبدیل کر لیتا ہے، نہ تو آپریشن مکمل ہو پاتا ہے اور نہ ہی بے سدھ معاشرے کو ہوش میں آنے دیا جاتا ہے۔ان کے نزدیک شاعر کا منصب یا مسئلہ خالصتاً شاعری کرنا ہے۔شاعر عرُوض اِختیار کرے یا غیر عرُوضی شاعری کرے، اُسے بہر طور تخلیق کے اِرتقائی عمل میں اِضافہ کرنا چاہیے۔ کوئی شاعر اپنے دیہاڑی دار حواریوں کے کاندھے پر چڑھ کر بڑا ادیب نہیں بن سکتا۔ شاعروں کی زیادہ سے زیادہ کامیابی یہی ہوتی ہے کہ وہ عوامی مشاعروں یا کمرشل آڈیو ویڈیو اور فلم سے نام نہاد شہرت کما لیں۔ سنجیدہ شاعر کو اِس امر کا اِنتخاب کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس اِعتبار سے تخلیقی عمل کو اِمکانی طور پر آگے بڑھائے۔ تاہم جو شخص عمر بھر ادب سے وابستہ رہے، وہ بِلا شُبہ قابلِ اِحترام ہے۔ معروف شاعر عبدالرشید کے مجموعہ کلام ''انور ادیب کے لیے نظمیں'' کا محاکمہ کرتے ہوئے اظہر غوری لکھتے ہیں:

> ''عبدالرشید نہ صرف شعوری اور لاشعوری طور پر ماضی کو اپنی نظموں میں منعکس کرتے ہیں، بلکہ مستقبل کا سفر بھی برابر جاری رکھتے ہیں۔ اُن کی نظمیں چار ارب برس کے پھیلاو کو سمیٹنے کی کوشش کرتی دِکھائی دیتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی لفظیات سے اپنی سماجی جُرأت اِختراع کی ہے۔ اُن کی نظموں میں بیسویں صدی کی جدید ذِہنی بلُوغت اور خود تنقیدی کا وہ رویّہ واضح ہے، جس نے ۶۰ء کی دہائی میں اُردو شاعری کی تاریخ اچانک تبدیل کر دی تھی، اِنسانی جبِلّت کا سب سے زیادہ اِحساساتی پہلُو ہیجان، عبدالرشید کی نظموں میں شعری قوّت بن کر جھلکتا ہے۔ ہیجان کا یہ جوہر تجسُّس، نزاع پسندی اور جنسی جبِلّت کے اِحساسات سے وابستہ ہے، جو خارجیت سے تعلق، اِحساسات کی شِدّت، اِضطرابات، جسمانی تغیرات اور کچھ کرنے یا کر گذرنے کے رُجحانات سے معمور ہے۔ عبدالرشید کی شاعری میں در آنے والے جذبات ترقی یافتہ تخلیقی شعور میں ہی پائے جانے ممکن ہیں۔ عبدالرشید کی نظموں میں روزمرّہ، بندشوں اور الفاظ کے دروبست کا جائزہ لیں تو ہم اِس شعری مواد کی اہمیت کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حقیقی تخلیق کار اپنا شعری لحن بھی خود ہی تخلیق کرتا ہے۔''(۳)

درج بالا اقتباس سے واضح ہے کہ دائمی تخلیقی ادیب تو وہی ہے، جو فرمایشی، چلت یا تجارتی کھپت کے بجائے اپنی فطرت اور اپنی ذات کا باشعور اظہار کرتے ہوئے سماج میں آگاہی و ادراک کی ترویج کرے۔ یہ شہرت حاصل کرنے کی

خاطر، انعام واکرام، خلعتِ فاخرہ، اعزازات وظائف، لقب وخطاب اور لالچ میں ادب نویس کا پیشہ اختیار کرنے والے ہر دور میں ہی عبوری یا وقتی فوائد اُٹھاتے ہیں۔ وہ قصیدے، قوالی، فرقہ وارانہ اصناف، موضوعاتی نغمے، ترانے لکھ سکتے ہیں، یا پھر کسی نہ کسی سیاسی جماعت اور غیر سیاسی نیوٹرل ادارے کے نظریۂ ضرورت کی بیانیہ نویسی سے نہ تو کوئی غیر ذمہ دار، سماجی اقدار نا آشنا ہجوم کسی مجوزہ قوم میں منقلب ہو سکتا ہے اور نہ ہی محبِ وطن سرفروشوں کی کوئی تنظیم تشکیل پا سکتی ہے۔ یہ زعم خود نظریاتی ادبا فکری اعتبار سے غیر وابستہ جہت نما کی حیثیت سے ادبی تخلیق وتنقید نہیں کر پائے، وہ کسی اندرونی یا بیرونی ایجنڈے کی تعمیل انجام دینے میں منہمک رہے، لہٰذا آمریت کے خلاف ردِّ عمل، مزاحمت، بغاوت اور انسانی حقوق کے لیے کبھی حال ساز گار نہ ہو پائے۔ بہرکیف کذب اور ناقص علم وادب کے مطالعے سے حریص، بدعنوان، لاقانونیت پسند، خائن اور راہزن قارئین معرضِ وجود میں آنے لگے اور ان کی موجودہ نسل علم وادب، سائنس وٹیکنالوجی کے بجائے صرف اور صرف غیر ذمہ دار تعیش پرست ہے۔ ادارہ جاتی انتشار ومقتدرانہ کشمکش کے شاخسانے میں نہ صرف تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی آزادی کا اختلاف ہوا، بلکہ نیا نظام، نئی زندگی اور زندہ قوم کے آثار بھی ابتدا میں ہی دُھندلا دیے جائیں گئے۔ اب تو عوام کے نام نہاد نمایندگان، حکمران، مقتدرہ اور ریاست کے ستون کہلانے والے ادارے بھی نظریۂ حیات، مقاصد، روایات اور تاریخ تک کو محو کر چکے ہیں۔

اظہر غوری کے مطابق تہذیبی وحدت کی بنیاد میں جغرافیہ اور لسانیات کارفرما ہوتے ہیں، پاکستان میں شامل کیا جانے والا ہر صوبہ آدھا اُدھورا تھا، علاوہ ازیں پچھتر (۷۵) برس بیتنے کے باوجود آج بھی سرکاری زبان انگلش ہی ہے جب کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق دس سال کے اندر اردو کا نافذ کیا جانا تھا۔ تہذیبی وحدت کی صفات سے عاری زبان وادب بے تاثیر اور بے روح رہتا ہے۔ یہاں اردو ادب کی توسیع کیا ہونی تھی، فقط مافیا اداروں کی جانب سے پہلے متروکہ "وقف شدہ" املاک کی بندر بانٹ، سرکاری اراضی پر قبضوں اور پھر بچے کھچے سبزہ زاروں کو ہتھیا کر ہاؤسنگ سکیموں سے ہوس زر کا بازار ہی گرم ہو سکا ہے۔ صورتِ حال یہ رہی کہ مقامی ادب کا تقسیمِ ہند سے قبل تک تخلیق کیے جانے والے اردو ادب سے بھی ہر رِشتہ منقطع ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کی ادب نویسی کسی اجتماعی تجربے یا اجتماعی طرزِ احساس کی آئینہ داری سے قاصر رہی ہے۔ درحقیقت یہاں کے محافظ ہی ڈاکو، سمگلر، رہزن، اغواکار، بھتّاخور اور قاتل ہیں۔ عوام مسلسل محرومیوں، بے اطمینانی، عدم تحفظ اور خوف کا شکار ہیں نہ تو کوئی اپنے گھر میں محفوظ ہے اور نہ ہی سڑک پر۔ ایسے میں مطالعہ وتحریر کا ذوق کون جاری رکھے۔ یہاں آج بھی نوآبادیاتی طرزِ احساس پر مبنی ادب نویسی ہو رہی ہے۔ یہ فرسودہ نظام کسی مسخ شدہ گلی سڑی لاش کے مانند لاوارث، تعفن، ناگواری، افسوس، ہزیمت، ناکامی اور مایوسی کے پے در پے حملوں کی زد میں ہے، اگر ادبا فسطائیت کی یلغار کا مقابلہ کر سکتے تو اردو ادب کو تخلیقی تشخص مل پاتا۔ ہر قومی ادارہ نظریۂ پاکستان کی روح کا منکر ہے، جب کہ دو قومی

نظریے کو باہمی فرقہ واریت میں منقلب کر کے جاری رکھا گیا۔ اسی ذیل میں ادبیات بھی نمایاں ہے۔

بھارت نے تو تقسیمِ ہند سے قبل ہی اردو رسم الخط کے مقابلے میں دیوناگری رسم الخط اپنا کر ہندوستانی تہذیب و ثقافت، ادب، ادبی تحقیق اور تنقید کی بنیادیں استوار کر لی تھیں۔ البتہ اردو ادب کو پاکستانی ادب فقط اس لیے ہی گردانا جاتا ہے کہ یہاں بیش تر لکھاریوں کو فقط اردو ہی لکھنی آتی ہے اور اس کے قارئین یا پُرستار پاکستانیوں کے علاوہ دنیا بھر میں کہیں دستیاب نہیں۔ یہاں ریاستی پابندیوں کے علانیہ نفاذ سے پہلے معدودے چند ادبا نے ہی ہجرت اور بعد ازاں جلاوطنی کے تجربے کو تخلیقی ادب سے مملو کیا تھا، جب کہ دیگر نے تو ہر موضوع اور معاملے کو مذہب، مابعد الطبیعیات، توہمات اور مزاحیہ پھکّڑ بازی کے رنگ میں رنگ دیا، مزید تمام تر نام نہاد ادب آمریت کی ہمنوائی اور اسی کے حق میں جواز تلاش کرنے کی بھونڈی سعی پر مبنی ہے۔ ادبا نے حکومتی قدغنوں، پابندیوں اور ممنوعیت سے بچنے کی خاطر اپنے معروضی حال کو ادب میں ڈھالنے کے بجائے مغربی فنون و ادب کی حقیقی تحریکوں کو غیر فطری طریق پر چربہ سازی، سرقہ اور نقالی کے ذریعے بروے کار لا کر مقامی آقاؤں کو "سب اچھا ہے" کے منفعت بخش اشارے دیے۔ ان کے اسی عصری شعور کی بازیافت اور رونمائی اس پیراگراف میں ملاحظہ فرمائیں:

> "چوں کہ ہمارے ہاں دیگر کئی مذہبی ممالک کی طرح حکومتی سطح پر متعدد بار مذہب کا من مانا اِستعمال ہو چکا ہے، اِس لیے ہمارے عوام بیش تر مواقع پر اپنے حقوق کی خاطر کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے کہ اُنھیں فتواے الحاد سے واقعی خوف آتا ہے۔ آج تک وہ شرک سے بچنے کے لیے آمروں کو ظلِ اِلٰہی اور خدا کا شریک ٹھہرانے پر مجبور ہیں۔ خواہ ۵۸-B۲ کا اِستعمال ہو یا جھرلو چلایا گیا ہو، یا پھر پی سی او کے تحت حلف اُٹھانے والی عدلیہ سے حقِ حکومت لیا گیا ہو۔ ہمارے علما اور نیک عوام کا مسلک یہی ہے کہ خدا جسے عزّت بخشنا چاہے، اُسے حکمران بنا دیتا ہے۔ مزید برآں حکمران کبھی غلط نہیں ہوتے، بلکہ جیسے رعایا کے اعمال ہوں، اُس پر ویسا ہی حکمران مسلط ہوتا ہے۔"(۴)

اظہر غوری کا مؤقف ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ادیبوں نے اس سماج میں ظلم و جبر کے طویل دن، شامِ غریباں اور شبِ غم کا ہی سامنا کیا۔ غیر آئینی اور غیر قانونی حکمرانوں اور عوام کی لاعلمی، بے ہنری اور لاچاری نے بڑے بڑوں کو تباہ و برباد اور کنگال کر دیا۔ وطنِ عزیز میں کام اور محنت کیے بغیر ناجائز طریق پر پیسا کمانا بہت آسان بنا دیا گیا۔ ہر قومی ادارے پر بدعنوانوں، دلالوں اور مافیا کے ذریعے قابو پا لیا گیا، اور سب سے باعزت روزگار یا کاروبار مافیا سے وابستگی بنا دیا گیا۔ سیاست دان اور سرکاری افسران کو منی لانڈرنگ، رشوت اور کمیشن کی راہ پر لگا کر عیاشیوں اور کمزور لمحات کی آڈیو، ویڈیو فائلیں بنائی جاتیں۔ پھر بلیک میلنگ اور بدنامی کی دھمکی دے کر یا شریکِ جرم نہ بننے پر دھونس، دھاندلی، اغوا، گھر پر

دھاوے اور قتل و غارت کا غیر مختتم سلسلہ جاری ہے۔ من حیث المجموع حزبِ اقتدار حزبِ اختلاف کو یا ہر ایک اپنے مخالف کو مذاکرات، بحث و تمحیص، اختلافِ رائے اور دلیل دینے کے بجائے کافر، غدار یا دہشت گرد قرار دے کر جان چھڑوانا چاہتا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا کہ ہماری آیندہ نسل حقیقت پسند، سائنس و ٹیکنالوجی سے بہرہ مند، معاشی خوش حالی اور ترقی سے سرفراز ہو۔ کوئی بھی مقتدر دوسرے فریق سے مذاکرات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، غیر جانب داری کے دعوید اروں میں بھی برداشت کا یارا نہیں ہے، سبھی کے سر پر مار دینے یا مر جانے کی شدت پسندی سوار ہے۔

سارے معاشرے میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا، بہتان و الزام تراشی، دشنام و پراپیگنڈا، ڈِس انفارمیشن، غیبت اور لعن طعن کی بد چلنی کا بازار گرم ہے۔ مقامی نظام پر غالب ٹولے نے خیر و شر، سچ اور جھوٹ، امین و خائن، نیک و بد، نظریے اور سازش، جمہوریت اور آمریت میں کوئی تفریق، تمیز یا حدِ فاصل باقی نہیں رہنے دی۔ اصل اور نقل، خالص اور ملاوٹ کو یوں گوندھ کر مشکوک بنا دیا گیا ہے کہ کوئی بھی ان کی علیحدہ علیحدہ شناخت نہیں کر سکتا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ کسی بھی مخالف کو پہلے اغوا یا گرفتار کر کے سزا دے دی جاتی ہے، جب کہ اس کے خلاف مقدمہ بھی درج نہیں ہوتا، یا پھر بوقتِ ضرورت بعد میں مقدمہ قائم کر دیا جاتا ہے، مزید یہ کہ عدلیہ بھی معلوم نہیں کروا سکتی کہ کوئی غیر قانونی اقدام اور ظلم کس کے حکم پر روا رکھا گیا، اگر عدالت کسی بے گناہ کو ضمانت پر رہا کر دے تو اُسے فوری طور پر احاطۂ عدالت سے یا پھر ضمانت ملتے ہی جیل کے دروازے پر ہی دوبارہ اغوا کر لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ ابراہیم کے مطابق پاکستانی مقتدرہ نے خدا کے احسان کو ناشکری میں بدل دیا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔ بے اطمینانی، انتشار اور سماجی عدم تحفظ کی تمام تر صورتِ حال شعرا، نثر نگاروں اور ناقدینِ ادب کے لیے یکساں باعثِ تشویش ہونی چاہیے، کیوں کہ وہ اپنے معاشرے میں امن، خوش حالی، انسانی حقوق، بلندیِ اقدار، حقیقی انصاف اور ترقی کے تصورات کو پروان چڑھانے کے ذمہ دار ہیں۔ معاصر ادبا اور ناقدین کو اپنے قارئین کی بقا کی جنگ لڑنے کا فریضہ انجام دینا چاہیے، ورنہ کسی بھی وقت اُن کے حاصل کردہ نجی مفادات خائن آمروں کے گماشتے لوٹ کر لے جاتے ہوئے انھیں بھی شہادت کے مرتبے پر فائز کرتے جائیں گے۔ اظہر غوری کے نزدیک:

> ”گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں دس اور بالخصوص مقامی فنون و ادب بیش تر انفرادی و داخلی کیفیات کو خیر باد کہ چکے ہیں۔ یوں معروضی حقائق کا کلمہ ہر ادیب کی زبان پر ہے، جس کے زیرِ اثر تمام شعبہ ہاے حیات اور تمام فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ تمام تر زراعت، صنعت و حرفت، معیشت، اقتصادیات، سائنس، ٹیکنالوجی اور سیاست و ریاست کو سماجی مقاصد کے لیے بہ روے کار لانے کا نعرہ رائج الوقت بِٹ کوائن کا درجہ

اختیار کر چکا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کی تشکیل تک عوامی خدمات کا حلف اور منصب بھی منی لانڈرنگ کی طرح مختلف کھاتوں میں گھما پھرا کر عدم آباد میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ دراصل مارکس اور اینگلز کے نظریات سے جہاں معاصر ترقی یافتہ دنیا کی تاریکی روشنی میں نہائی، وہیں برصغیر جیسے خطوں میں خیر گی، اندھے پن، افراطِ زر، کساد بازاری اور بدچلنی کا دور دورہ ہوا۔ ہر بیوروکریٹ، ٹیکنوکریٹ سربر آوردہ مقتدر کسی نہ کسی عالمی مالیاتی ادارے اور طاغوتی قوت کا گماشتہ ہے، سبھی ممالک میں اسٹیبلشمینٹ اپنی جغرافیائی حدود اور سوشل ڈس انفارمیشن میڈیا کے غلام عوام پر جبر و قہر مسلط کر رہی ہے۔ اجتماعی فلاح کے منصوبوں کے پس پردہ سبھی صرف اور صرف خود غرضی، لوٹ کھسوٹ، بندر بانٹ اور قتل و غارت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اِس صورتِ حال میں حساس، مخلص، ہمدرد، محنتی اور دیانت دار فرد ہی ناکام و نامراد ٹھہرتا ہے۔ ایسے میں ہمارے سابق ریاستی احکامات اور بیانیوں کے مانند معاصر ریاستِ مدینہ میں مسافروں، مہاجروں، مزدوروں، محتاجوں اور انسان دوستوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی۔"(۵)

اظہر غوری کے خیال میں اب ادیب اور نقاد کا روایتی مدرسانہ کردار معدوم ہو چکا ہے۔ ٹی وی چینلز پر جاری فضول پھکڑبازانہ سٹیج شو اور غیر حقیقی بے راہ روی کے نمایندہ ڈراما سیریل، بے تاثیر اور بے معنی ہو چکے ہیں۔ عوام پڑھنے اور دیکھنے کے مشاغل سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ اس ناآشنائی، اجنبیت اور مغایرت کے لاتعداد محرکات ہیں۔ تقسیمِ ہند کی سفاکانہ ہجرت، ماورائے آئینی و قانونی ریاستی نظام، روزِ اوّل سے انتخابات میں دھاندلی اور نتائج کی تبدیلی، جمہوری حکومتوں کا ناجائز خاتمہ، وزرائے اعظم کی برطرفی، قتل اور عدلیہ کو غیر فعال بنا کر آمریت کو دوام بخشنے، مہاجرین اور دہشت گردوں کی آبادکاری، سرحدوں پر کھلم کھلا سمگلنگ، انجینئرڈ انتخابی عمل، اچھی طرزِ حکمرانی اور خدماتِ عامہ کا فقدان، جموں و کشمیر اور لداخ کے ساتھ چار پاکستانی دریا بھارتی قبضے میں دے دینا، سقوطِ ڈھاکہ سمیت کسی بھی قومی سانحے اور سیاسی ناکامی کے ذمہ داروں کو سزا دینے کے بجائے ہیرو بنانے، صنعتی بر آمدات اور ذرائع روزگار کا خاتمہ، افراطِ زر، کساد بازاری، اہلِ خانہ سمیت خودکشی سے قبل ڈاکازنی کا ارتکاب وغیرہ ایسے المیے ہیں، جنھوں نے معاشرتی ارتقا پر دُور رس منفی اثرات مرتب کر کیے جس نے ادیب اور نقاد کی سٹّی گم کر رکھی ہے، ایسے دگر گوں حال میں اوسان خطا کر بیٹھے ہوئے حواس باختہ غیر ذمہ، دار ادیب و نقاد کی جگہ بے روزگاری اور موت کے ڈر سے بے نیاز معدودے چند صحافتی تجزیہ کار ٹیوٹر، یوٹیوب، فیس بُک، ٹک ٹاک، اور دیگر سوشل میڈیا چینلز اور ذرائع ابلاغ نے اپنی استطاعت، استعداد اور مقدور بھر

ادیب اور نقاد کے فرائضِ منصبی بھی سنبھال لیے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کی طرح ادبی دبستان بھی مافیا اور مارشل لا جیسی قوتوں کے پروردہ ہیں۔ یہی وَجہ ہے کہ اب محبِ وطن لوگ نہ تو ادب پڑھنے پر راغب ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی ٹی وی چینل دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، انھیں ایسے ادب پاروں کی تلاش اور انتظار ہے، جو اپنے عہد کے بنیادی سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی معاملات و مسائل کی غمازی اور حل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حرمت اور اعلیٰ معاشرتی اقدار کی بنیاد اُستوار کر سکتے ہوں۔

اظہر غوری کے مطابق اگر ادبا اپنے اہلِ خانہ، اپنے رفقائے کار، اہلِ وطن اور اپنے قارئین کو آئین و قانون کی بالادستی اور ہر ایک فرد کی یکساں آزادی کا تصور ذہن نشین کرواتے اور عملی طور پر بھی آزادی کے قیام و استحکام کا فریضہ انجام دیتے تو یہاں آمریت کے پروردہ منتخب شدہ افراد کے ذریعے تبدیلی لانے کے حربے اختیار کرتے رہنے کے بجائے حقیقی جمہوریت قائم دائم ہوتی، عوام ذہنی طور پر غلامانہ زندگی کو مسترد کر دیتے، لوٹ کھسوٹ کی جگہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور ہمدم ہوتے۔ حرص و ہوس بلاشبہ غلامانہ فطرت کا شاخسانہ ہے اور طالع آزماؤں کے ساتھ ساتھ ادبا بھی اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں تاریخ سے یہی درس ملتا ہے کہ دانش ور، تخلیق کار، اشرافیہ اور حکمران طبقے کی جو ذہنیت اور کردار ہو گا، عوام کا اجتماعی شعور اور قول و فعل بھی بالکل ویسا ہی ہو گا۔ تاریخی شعور کے حامل شاعر ثاقب ندیم کی بپتا سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ثاقب ندیم روایتی تغزل کے رسیا اور حسن و عشق کے مارے ہوئے نہیں، بلکہ تاریخی شعور کے حامل شاعر ہیں۔ مارشل لائی لاقانونیت کی شبِ یلدا میں دیگر ہم وطنوں کے مانند وہ نہ تو بے فکری سے بچپنے کی اٹھکیلیوں کا حظ اُٹھا پائے اور نہ ہی مستقبل کے اندیشوں نے انھیں جوانی کے مزے لوٹنے دیے، آخرِ کار وہ تسکینِ فن اور تعمیرِ وطن کی خاطر لاتعداد جلاوطن پیش روؤں کے نقشِ قدم پر اپنے پیر جماتے جماتے ہجرت کر گئے کہ اس سماج میں ہر صبح کے رخ پر فقط رات کی راکھ ہے، جہاں ساری نخوت اور انا پیٹ کی بھوک میں گم ہو چکی ہے۔ غالباً اِس غیر عادلانہ نظام میں مقید رہ کر میثاقِ غلامی اور ناروا سمجھوتے کرنے کی نسبت کسی بھی جمہوری معاشرے میں دوسرے درجے کی شہریت کا حصول بھی نعمتِ غیر مترقبہ ہوتا ہے۔ یقیناً یہ ریاست اپنے اندر ”مستور انسان کی بپتا“ کا راگ الاپ رہی ہے۔“(۶)

اظہر غوری ادب اور تنقید کے قارئین کو ادراک دیتے ہیں کہ نہ تو اُس کے ہم وطن کوئی قوم بنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اُنھوں نے ادبی و ثقافتی مظاہر کی جڑوں کو کھوجنے اور ان کا مصنوعی تعین کرنے کی سعی کی، وہ جانتے ہیں کہ یہ خطہ ازمنہء

قدیم سے ہی بیرونی حملہ آوروں کی زد میں رہا اور یہاں کے باسی نہ تو دھرتی کو ماں سمجھتے ہیں اور نہ ہی ارض زادے ہیں۔ وہ یا تو مقتدرہ کے شانہ بہ شانہ اور ہم زبان ہو کر اپنے ہموطنوں کا ناجائز استحصال کرتے ہیں، یا پھر جاگیر داروں، سرمایہ داروں، اداروں پر اجارہ داری قائم رکھنے والے مافیا، ہاؤسنگ سکیموں کے قبضہ گروہوں، قدرتی آفات کی امداد، صوابدیدی فنڈز اور سبسڈی ہڑپ کرنے والے حکمران ٹولے، ذخیرہ اندوز تاجروں کے اشترک سے بنائے ہوئے اس غلام ساز نظام میں بنامِ امن محکومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ دراصل جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی سرحدیں وہ طوق ہیں، جن میں عوام کی گردنیں شکار کیے ہوئے جنگلی ہاتھیوں کے مانند کسی ہوئی ہیں اور ان کے جسموں پر مہاوت اپنے آنکس ہمہ وقت تازیانوں کے مانند برساتے رہتے ہیں۔

محبِ وطن بقائے حیات کی جنگ لڑنے کے لیے اپنی جائے پیدائش تیاگنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے، نہ ہی وہ اغیار ممالک کی شہریت حاصل کرنے کے لیے اپنی املاک گروی رکھنے اور سبھی رشتے تک بیچنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ تاہم معاشرتی ناانصافیوں سے تنگ آئے ہوئے جو لوگ بندی خانے سے فرار کا منصوبہ بنائیں، انسانی سمگلروں کے جان لیوا جال میں پھنس کر کسی ملک کی سرحد غیر قانونی طریق پر پار کرتے ہوئے مارے جائیں، ان کی کشتیاں یونان یا اٹلی کی سمندری بے رحمی میں غرق کر دی جاتی ہیں۔ اظہر غوری جانتے ہیں کہ مقامی اور بین الاقوامی ادب ایک تجارتی ہدف ہے، جو اس پر پورا اترے، اسی پر انعامات، تمغوں، اور پر تعیش نوازشات کی برسات ہوتی ہے، وگرنہ تخلیق کار کی زندگی کے آہنی معمولات محنتِ رایگان اور ذوق و شوقِ فضولیات کی کٹھالی میں پگھلا دیے جاتے ہیں۔ نغمے، ترانے، بیانیے اور نعرے تخلیق کرنا جلبِ زرق اور حصولِ معاش کے معاملات ہیں۔

اظہر غوری کا مؤقف ہے کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کے متلاشی ناقدین دراصل فراعین کے مدفون خزائن اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی طرح سے اپنی اہمیت منوانے اور نام نہاد شہرت پانے کی لت میں مبتلا ہیں، وگرنہ ہماری معاشرتی تہذیب و ثقافت کی آئینہ داری بدعنوانیوں، بداعمالیوں، رشوت کی گرم بازاری، راہ زنی، خیانت، قبضہ و بھتامافیا، اغوا برائے تاوان، ناجائز استحصال سے بخوبی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ تاہم یہاں سوچ، تخلیق، فلسفہ، ایجاد پر بھی پابندی عائد کر کے آزادیِ جمہور، آزادیِ اظہار اور آزادیِ فکر کو پابند کرنے کے بعد مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ اس خطے میں دیگر بڑے بڑے فیصلوں اور آئین و قانون کے مانند بند کمروں میں اختراع کردہ تہذیب و ثقافت جبراً مسلط کر دی گئی۔ نتیجتاً ہمارا ادب غالباً کسی اور ہی دنیا کا عکاس و نمایندہ محسوس ہوتا ہے۔ اظہر غوری کے خیال میں قول و فعل کے تضاد نے اس ترقی یافتہ دنیا میں بھی ہماری معاشرت کو پتھر کے زمانے اور قبائلی نظام جیسے انتشار و افراتفری اور پس ماندگی سے دوچار کر رکھا۔ اس خطہء ارض پر بزعمِ خویش آفاقیت کے علم بردار ترقی پسند بھی دیگر رجعت پسند اور مفاد پرست دانش وروں جتنے ہی طالع آزما اور طمع پرست ہیں۔ یہ دائیں اور بائیں، جمہوریت اور آمریت، غریب اور امیر، عوام اور حاکم کے بیانیے تفرقے بازی، گروہی

تعصبات اور مبتلاے جہل عوام کی طبقاتی تقسیم کو دوام بخشنے کی خاطر متواتر دُہرائے جاتے ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ واقعتاً عوام نابلد، ناآگاہ، بے وقوف اور بے شعور ہیں، ان کی مجبوری سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں کہ نہ تو ان کے پاس دُہری شہریت اور سیاسی پاسپورٹ اور بیرونِ ملک اثاثے، املاک اور بینک بیلنس ہیں اور نہ ہی وہ اس غلامانہ نظام کی بیڑیوں سے آزادی حاصل کرنے کی سکت اور عزم رکھتے ہیں۔

اظہر غوری کے بقول پاکستانی ادب کے پچھتر (۷۵) برس قارئین کو مطالعے، تفہیم، سوال اُٹھانے اور جواب سے نارسائی کے ریاستی حربوں کی تاریک تاریخ کی دستاویز پر مبنی ہیں۔ تعلیمی اداروں کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں بھی طلباے علم کو لاعلمی اور غیر فعال بنانے کا حیلہ ہیں، یہی وَجہ ہے کہ ناخواندگی اور جعلی تعلیمی اسناد ہی زیورِ تعلیم کے درجے پر فائز ہو چکی ہیں۔ ہر فرد ملکی مفاد اور عوامی فلاح کے بجاے فقط اپنے عیش، آسائش، امارت اور اختیارات کے حصول کی خاطر اپنی ماں کا سودا کرنے کو بھی تیار بیٹھا ہے۔ اظہر غوری کے نزدیک عصرِ حاضر میں خواتین بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں جتنا کہ مرد حضرات کیوں کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں پر خواتین نے اپنی اہلیت اور قابلیت کے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ ہر عورت انفرادی شخصیت ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ماضی میں زمامِ کار جتنی مرد کے ہاتھ میں تھی اب اتنی ہی عورت کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ ان کا خیال ہے:

> ”عورت علوم، فنون، ٹیکنالوجی، سائنس پر عبور حاصل کرتی چلی جا رہی ہے، ورنہ بے شعور، اَن پڑھ، جاہل مرد بھی کسی اہمیت کے حق دار نہیں ہوتے۔ عالمہ، فاضلہ اپنے تخلیقی مدارج از خود طے کر رہی ہے اور اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنے تصورات کی تجسیم بھی خود ہی وضع کر رہی ہے۔ بالغ نظر خواتین نے متعصب مردوں کے نافذ کردہ قوانین اور پابندیاں منسوخ و رد کر دی ہیں۔ وہ پروا نہیں کرتیں کہ سماج میں اُن کے بارے میں کس طرح کی قیاس آرائیاں، مفروضات، تصورات، الزامات اور آڈیو، ویڈیو سکینڈلز مروّج یا وائرل کیے گئے ہیں۔ باشعور خواتین نہ تو مردوں کی ہم خیال بننا چاہتی ہیں اور نہ ہی مردوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ بلاشبہ خود آگاہ عورت بھی مرد جتنی جفاکش، تنومند اور طاقت ور ہوتی ہے، اُسے مردانہ کمزوریوں کا بخوبی ادراک ہے، اور وہ مردانہ اعصاب پر سواری کرنے کی ضد یا خبط میں مبتلا ہونے کے بجاے کاملاً خود مختار اور بااختیار ہوتی ہے۔ کارکن عورت خود کو شوہر کی خدمت اور گھریلو کام کاج کے لیے کاملاً وقف نہیں کر سکتی، چوں کہ وہ مرد ہی کی طرح معاشی طور پر خود کفیل ہوتی ہے۔ اگر ایک مرد کسی چیز کو دُوسرے مرد کی نظر سے نہیں دیکھتا تو

عورت کیوں مرد کے مانند سوچے اور مردانہ راے کس لیے قائم کرے۔ دراصل عورت کو تفوق حاصل ہے، وہ کچھ ایسے تجربات سے بھی گذرتی ہے جن سے مرد محروم ہیں۔ تاہم معاصر اَدَب میں تانیثیت اور مردانیت کے مساویانہ اجتماع سے نیا فکر مرتب ہو چکا ہے، جو صنفی تفریق کے بجاے انسانی احساس و اظہار کا مثالی نمونہ ہے۔"(۷)

اظہر غوری کی ادبی تنقید کا تناظر معاشرے پر نافذ کردہ دباؤ، جبر اور تشدد ہے۔ انھوں نے سماجی مظاہر کے دگرگوں اثرات پر مبنی اپنی نظموں کے ساتھ ساتھ تنقید میں بھی نام نہاد جمہوری اور آمرانہ ادوار کے دوران میں غیر جمہوری، غیر آئینی اور غیر قانونی اقدام کے خلاف یکساں قلمی مزاحمت کا فریضہ انجام دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب اور تنقید کا مقصد دراصل قاری اور عوام الناس کے حقوق، سماجی سہولیات اور آزادیِ اظہار کا تحفظ کرنے کی خاطر راہ نمائی یا جہت نمائی کرنا ہے، مگر بالعموم عوام اور بالخصوص اردو ادبا بھی جمہوری طرزِ احساس، انسانی حقوق اور آزادیِ اظہار کے رویوں سے قطعی نابلد ہیں، چوں کہ وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر تادمِ آخر کسی جمہوری ملک کے سفر پر گئے، نہ جمہوری سماج میں کبھی جینے کا تجربہ حاصل کیا، لہٰذا وہ اپنی معاشرتی مجبوریوں کے پنجرے میں دانہ دنکا چگ سکنے کو ہی یا ۱۴/ اگست کے موقع پر موٹر سائیکل کا سائلنسر اتار کر کوئی پٹاخا چلانے اور کسی پر آوازہ کسنے کو ہی حقیقی آزادی گردانتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی پالتو پرندے کو پنجرے کی تنگی میں گھٹن کی اذیت محسوس نہیں ہوتی، حصارِ سلاسل کو وہ اپنے لیے اقدامِ تحفظ سے تعبیر کرتا ہے، چوں کہ اُسے آزاد فضا کے بارے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔

ریاستی نظام نے ہمیں آزادی کا یہ مفہوم دیا کہ خواہ ہمیں کوئی فائدہ نہ ہو، پھر بھی دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے، بے شک ہمیں کبھی عزت نہ مل پائے، ہمیشہ دوسروں پر کیچڑ اُچھالتے رہیں، اپنی بدکاریوں سے توجہ ہٹانے کی خاطر ہر ایک کی کردار کشی کسی مہم کی طرح کرتے رہیں، اس ناسور بنے ہوئے نظام کی پردہ داری کے لیے مسیحائی کا عزم رکھنے والوں کو برہنہ کر کے اور تشدد کا نشانہ بنا کر باقیوں کو عبرت دلانے کے لیے سوشل میڈیا پر ویڈیوز وائرل کی جائیں۔ وہ اپنے قاری کو غیر مشروط محبت، امن، سچائی، ایمانداری، معاشرتی عدل، سماجی مساوات اور انسانی حقوق کی اہمیت سے آگاہ کر کے غیر جمہوری طرزِ فکر سے نفرت کرنا سکھاتے ہیں۔

اظہر غوری کے مضامین کے مانند اُن کی نظموں میں بھی ان کے عملی تنقیدی نظریات کا پرتو جابہ جا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی نظریے کی توجیہہ، اور وضاحت کے لیے باقاعدہ تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ بیسیوں فن پاروں، مختلف اصنافِ ادب پر مشتمل تصانیف اور ادبا پر مضامین لکھ کر اُن کے تخلیقی نظریات کا جائزہ لیا ہے، بلکہ وہ ادب میں بھی تخلیقی اور جمالیاتی روایات، معیارات اور اقدار کے ارتقا پر یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے موضوعاتی حوالے سے ادب کا جائزہ لینے کے علاوہ دیگر تخلیقی پہلوؤں حتیٰ کہ اصناف کے تاریخی و تدریجی ارتقائی حوالوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اظہر غوری تخلیق

کاروں کے جماداتی طرزِ فکر کو معدنیات میں ڈھالنے، نباتاتی تخیل کو ثمر آور پیداوار میں منقلب کرنے اور غلامانہ نقطۂ نظر کو کسی مخصوص طبقے کی انفرادی حکمرانی کے بجائے عوام الناس کی اجتماعی حقیقی اور توانا ترین معاشرتی، معاشی اور سیاسی آزادی سے متمتع کرنے کا عزمِ صمیم رکھتے ہیں۔ وہ اِس امر کے شارح اور مبلغ ہیں کہ اردو ادبا کسی بھی نوع کی حزیمت، مجبوری، مصائب اور ماحولیاتی دباؤ کے باوجود قاری کو خیر خواہی، حمیت، ہمت اور حریت کے عملی اسرار و رموز سے نہ صرف آگاہ کریں، بلکہ کسی بھی صورتِ حال میں پسپانہ ہونے یا ہتھیار نہ پھینکنے کا درس دیں۔ مختصراً یہ کہ اظہر غوری ایک باشعور اور ذمہ دار ناقد ہیں، یہی وَجہ ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں حقیقتِ حاضرہ کا بے لاگ تبصرہ اور ہمہ گیر حاصلِ مطالعہ قارئین کو آگاہی اور ادراک سے بہرہ مند کرتے ہوئے تحرک آشنا بناتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ اظہر غوری، دو تہذیبوں کی دُہری معنویت کے حامل افسانے، مضمون مشمولہ: جہانِ رنگ و بو، از نیر اقبال علوی، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵ء، ص:۷

۲۔ اظہر غوری، نظریاتی مرصع کار افسانہ نگار: سمیع آہو جا، غیر مطبوعہ (یہ مضمون ۱۹ جولائی ۲۰۲۳ء کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی صدارت میں انجمن ترقی پسند مصنفین، لاہور کے خصوصی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

۳۔ اظہر غوری، ترقی یافتہ تخلیقی شعور کی شاعری، غیر مطبوعہ (یہ مضمون ۲۰۰۲ء میں عبد الرشید کے مجموعہ کلام "انور ادیب کے لیے نظمیں" کی تقریبِ رونمائی میں پڑھا گیا۔)

۴۔ اظہر غوری، عوام دشمن نظام کو بدلنے کا محرک: نقطہء نظر"، مطبوعہ ہفت روزہ "صراط"، ۲۰۰۹ء

۵۔ اظہر غوری، (یہ غیر مطبوعہ مضمون ۲۰۲۱ء میں اسلم گورداسپوری کے مجموعہ کلام "ملالِ بے ہنری" کی تقریبِ رونمائی منعقدہ لاہور پریس کلب میں پڑھا گیا۔)

۶۔ اظہر غوری، تاریخی شعور کی حامل شاعری، غیر مطبوعہ (یہ مضمون ثاقب ندیم کے مجموعہ کلام "نروان گھڑی کا سپنا" کی تقریبِ رونمائی منعقدہ لاہور پریس کلب میں ۱۶ جنوری ۲۰۲۳ء کو پڑھا گیا۔)

۷۔ اظہر غوری، سفید جھوٹ: ڈاکٹر عظمیٰ عزیز خان کے شاہکار افسانچے، مشمولہ: سفید جھوٹ از ڈاکٹر عظمیٰ عزیز خان، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۲۳ء، ص:۱۰۸